© rasailojaraid.com

بصادق ندیم

اسلامی قضا

اسلام میں دیگر امورِ شرع کی طرح قضا کا آغاز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہو لیا تھا، چنانچہ شارع علیہ السلام ہی اسلام کے پہلے قاضی تھے[1] جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ نے بعض علاقوں میں اپنے والی بھیجے جو بیک وقت حاکم بھی ہوتے تھے اور قاضی بھی، مثلاً حضورؐ نے معاذ بن جبل کو یمن اور عتاب بن اسید کو مکہ کی طرف بھیجا[2] اور ان اصحاب نے حضورؐ کی زندگی میں قاضی کے فرائض انجام دیے۔ خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے آقا کی اتباع میں خود مدینے میں فرائضِ قضا انجام دیتے تھے اور ان کے والی دیگر بلادِ اسلامی میں عامل ہونے کے علاوہ قاضی بھی ہوتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے دور تک یہی صورتِ حال رہی۔ چوں کہ خلیفۂ ثانی کے عہد میں فتوحات کا دائرہ پھیل گیا اور سلطنتِ اسلامی وسعت اختیار کر گئی، اب خلیفہ یا ان کے نائب کے لیے دشوار ہو گیا کہ حکومت کی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ قضا کے بوجھ کو بھی اٹھائیں۔ چنانچہ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے قاضی اور حاکم کے مناصب کو جدا جدا کر دیا۔ انھوں نے مدینہ میں اپنے ساتھ ابو الدردا کو قاضی مقرر کیا اور شریح کو بصرہ اور ابو موسیٰ الاشعری کو کوفے کا قاضی مقرر کیا۔ انھوں نے موخر الذکر کو جو خط لکھا وہ بہت مشہور ہے اور اس پر احکامِ قضا کا انحصار ہے جو اس میں مکمل طور پر آ گئے ہیں۔ اسلامی فقہ کے مولفین کی اکثریت نے اس خط کو اپنی تصنیفات کی اساس بنایا ہے۔ ابن حزم اندلسی (المتوفی ۴۵۶ھ) نے اس خط کو جعلی قرار دیا ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کے زمانے میں نہیں بلکہ حضرت عثمان کے زمانے میں کوفے کے والی تھے اور اس وقت کوفے کے قاضی شریح تھے۔ اس خط کی روایت میں قدرے اختلاف بھی ہے۔ ہم

---

[1] محمود بن محمد بن عرنوس، تاریخ القضاء فی الاسلام (قاہرہ، ۱۹۳۴ء) ص ۱۱

[2] کاسانی، بدائع الصنائع۔ مطبعۃ الجمالیۃ مصر ۱۹۱۰ء ص ۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسے ابن قیم الجوزیہ کی کتاب اعلام الموقعین سے نقل کرتے ہیں:

"امابعد، قضا فرض محکم اور سنت متبعہ ہے۔ جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو سمجھ بوجھ سے کام لو کیوں کہ جس حق کا نفاذ نہ ہو سکے اسے کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اپنی مجلس، توجہ اور قضا میں مساوات کو ملحوظِ نظر رکھو تاکہ صاحبِ منزلت کو تمہارے ظلم سے فائدہ اٹھانے کی رغبت نہ ہو اور نہ کسی ضعیف کو تمہارے انصاف سے مایوسی ہو۔ شہادتِ شرعی کا پیش کرنا مدعی کی ذمے داری ہے اور مدعا علیہ کے لیے قسم ہے۔ مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے مگر ایسی صلح نہ ہو کہ حرام کو حلال کر دے اور حلال کو حرام بنا دے۔ اگر مدعی کہے کہ مدعا علیہ اور شہادت غیر حاضر ہے تو اس کے لیے مدت متعین کر دو۔ اگر مدعی شہادت پیش کر دے تو اس کا حق اسے دے دو۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس کے خلاف فیصلہ دے دو۔ یہ بہترین عذر ہے اور غلطی سے بچنے کی مناسب ترین صورت ہے۔ تیرا آج کا فیصلہ آئندہ کے لیے بہتر اور ہدایت یافتہ فیصلے کو مانع نہ آئے جب کہ تو حق کی طرف مراجعت کر رہا ہو، حق ہی قدیم ہے۔ حق کو کوئی چیز باطل نہیں کر سکتی، حق کی طرف رجوع کرنا باطل میں پڑے رہنے سے بہتر ہے۔ مسلمان ایک دوسرے کے خلاف شہادت دے سکتے ہیں، بجز اس کے جسے جھوٹی شہادت کی سزا مل چکی ہو یا کوڑوں کا سزا یافتہ ہو یا جس پر دوستی یا قرابت داری کی تہمت ہو۔ بے شک اللہ نے باطن کو بندوں سے مخفی رکھا ہے اور حدود کھلی ہوئی شہادتوں پر ہی قائم کی جائیں گی یا پھر بذریعہ قسم کے۔ اگر کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے لیے قرآن یا سنت سے معاملہ معلوم نہ ہو سکے تو فہم سے کام لو اور امور میں قیاس کرو اور امثال تلاش کرو۔ پھر اس بات کا قصد کرو جو اللہ کو محبوب ترین ہے اور حق کے قریب ترین ہے۔ خبردار! غضب، قلق، ملال، اذیت، جھگڑے یا جھگڑے والوں کی ناپسندیدگی سے بچو (یہاں ابو عبید کو شک ہے کہ لفظ خصومت ہے یا خصوم) کیوں کہ قضا ایسا حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ اجر دیتا ہے اور لوگوں میں بھی اس کا ذکر خیر ہوتا ہے۔ جس کی حق کے معاملے میں نیت درست ہو، اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے معاملے میں اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اور جو جھوٹی زینت ظاہر کرتا ہے اللہ اسے ناپسند کرتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ صرف مخلص بندوں کو ہی قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ثواب و رزق عطا کرتا ہے اور اس کی رحمت کے خزانوں کی انتہا نہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔"

یہ خط نقل کر کے ابن القیم سند کے متعلق لکھتے ہیں: "ابو عبید کہتے ہیں: میں نے کثیر سے پوچھا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا جعفر نے اس کی سند دی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں۔ تاہم ابن القیم کہتے ہیں کہ یہ خط مکتوبِ جلیل ہے اور علما نے اسے شرفِ قبولیت بخشا ہے اور اس پر شہادت اور فیصلے کے اصولوں کی عمارت تعمیر کی ہے۔ حاکم اور مفتی اس پر غور و فکر کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کے بعد وہ اس خط کی شرح لکھنی شروع کرتے ہیں جو اعلام الموقعین کی پہلی اور دوسری جلد پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ خط کے مندرجات کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ واقعی احکامِ قاضی کا مرجع و اساس کتاب و سنت و قیاس اور امثال و نظائر ہیں اور دلیل کے طور پر حدیث معاذ کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ جلد اوّل کے صفحہ ۲۰۲ پر فرماتے ہیں [۳] "خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو نص قرآن و حدیث نہ ملنے کی صورت میں اجتہاد کی اجازت دی ہے۔ جب آپ نے معاذ کو یمن بھیجا تو پوچھا: اگر تمہیں عدالتی فیصلہ کرنا پڑے تو کیا کرو گے؟ معاذ نے عرض کیا: میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پھر پوچھا: اگر وہ فیصلہ کتاب اللہ میں نہ ہوا تو کیا کرو گے؟ عرض کی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف رجوع کروں گا۔ پھر فرمایا: اگر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی فیصلہ نہ ملا تو کیا کرو گے؟ معاذؓ نے عرض کیا: اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کے طریقِ کار پر اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا:"

خلفائے راشدین اور بنو امیہ کے عہد میں مندرجہ بالا احادیثِ نبوی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکتوب میں وضع کردہ اصولوں کے مطابق ہی عمل ہوتا رہا۔ ہر شہر میں علما کی ایسی جماعت موجود ہوتی تھی جو احکامِ شریعت اور تفقہ فی الدین کے اعتبار سے معروف تھی۔ قاضی کو جب کوئی دقت پیش آتی تو اس جماعت کی امداد حاصل کرتا تھا۔ بہت سے قاضی مشکلاتِ قضا خلیفۂ وقت کے پاس بھیجتے تھے۔ مصر کے قاضی عیاض بن عبید اللہ ازدی نے اپنے دور کے خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے شفعہ کے مسئلے میں خط لکھ کر استفسار کیا۔ بعض قاضی انتہائی ذہین تھے۔ قاضی شریح، شعبی اور ایاس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر کی ذکا کو بطور مثال مشہور شاعر ابوتمام نے مندرجہ ذیل شعر میں بیان کیا ہے:

۳؎ ابن القیم الجوزیہ: اعلام الموقعین، مطبعہ سعادۃ مصر ۱۹۵۵ء، ص ۲۰۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقدام عمرو فی سماحۃ حاتم فی حلم احنف فی ذکاء ایاس

علامہ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد ابن القیم الجوزیہ نے اپنی کتاب الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ میں قضاۃ کی فراست کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے:

خلفائے راشدین اور بنو امیہ کے دور میں قاضی اجتہاد سے کام لیتے تھے اور اپنے احکام میں کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ بلکہ لوگ تقلید سے نا آشنا تھے، کیوں کہ ابھی مذاہب اربعہ وغیرہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ دین و دنیا کے امور میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، خلفا اور فقہا صحابہ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ دولت عباسیہ کے اوائل میں بھی یہی کیفیت رہی، مگر جب خلیفہ منصور نے بغداد کو عروس بلاد اسلامیہ بنایا تو وہاں دنیا نے اسلام کے علما، فقہا، صناع، تجار سبھی جمع ہو گئے اور بہت سے علوم کا نشو و نما ہوا اور بہت سے اہل فارس، اہل روم اور اہل مصر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ فارسی، یونانی اور لاطینی زبان کی بہت سی کتابیں عربی میں نقل کی گئیں اور دوسری اقوام کے علوم اور عقائد کی نشر و اشاعت ہوئی۔ جدل اور مناظرے کا دروازہ کھل گیا۔ عقل کا بازار گرم ہو گیا اور فکر کی جولانیاں تیز ہو گئیں۔ احکام شرعیہ میں خلل کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ لہٰذا تدوین شریعت اور قواعد تفریع من اصول الشریعۃ کی ضرورت پیش آئی چناں چہ ابو جعفر المنصور نے حضرت مالک بن انس کو اس سلسلے میں ایک ایسی کتاب تصنیف کرنے کے لیے کہا جو حضرت ابن عباس کی رخصت (ڈھیل) اور حضرت ابن عمرؓ کی سخت گیری سے اجتناب کرے لہٰذا امام مالک بن انس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب الموطا تصنیف فرمائی۔ اسی عہد میں عظیم فقہا کا ظہور ہوا اور امام ابو حنیفہ کے علاوہ باقی تین امام بھی عہد عباسیہ ہی میں ہوئے اور اہل سنت میں مذاہب اربعہ کی ترویج ہوئی۔ اسی عصر میں قاضی القضاۃ (قاضیوں کے رئیس اعلیٰ) کا منصب معرض وجود میں آیا۔ ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم (المتوفی ۱۸۲ھ) پہلے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے، انھوں نے فقہ کی تدوین کی اور اہم کتابیں لکھیں مگر ان میں سے بہت کم ہم تک پہنچی ہیں، ان میں سے کتاب الخراج سب سے زیادہ مشہور ہے جو انھوں نے خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش پر لکھی تھی۔

اگرچہ فقہ کی تدوین سے قاضیوں کے پاس قوانین کا ڈھانچہ تیار ہو گیا اور مقدمات کا فیصلہ کرنے میں سہولت ہو گئی مگر فقہی اختلافات بڑھ گئے اور مختلف مذاہب فقہ باہم برسر پیکار رہنے لگے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ت بڑھ گئے۔ جج کا منصب تو یہ ہے کہ تعصبات سے بالاتر ہو، مگر محکمۂ قضا کسی نہ کسی مذہب فقہ سے
رہے بغیر نہ رہ سکا۔ ہر حکمران کا ردِ عمل اس صورتِ حال میں مختلف تھا، مگر سب سے عمدہ کام بلاد
کے امیر یوسف بن عبدالمومن (المتوفی ۹۱۹ھ) نے کیا۔ جب اس نے فقہا کے درمیان اختلافِ کثیر
یہ حکم دیا کہ قاضی فقہ کی فروعات کو چھوڑ دیں اور صرف قرآن شریف اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
بق مقدمات کا فیصلہ کریں، کسی کی تقلید نہ کریں، خود اجتہاد کریں اور قیاس اور اجماع پر انحصار کریں۔
علمائے اسلام نے منصبِ قضا پر فائز ہونے والے شخص کے لیے چند شرائط کا ذکر کیا ہے۔
پہلی شرط اسلام ہے اور قبولِ شہادت کی بھی شرط ہے، اس کی تائید میں یہ آیتِ کریمہ پیش کی جاتی ہے:
وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا۔
اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مسلمانوں پر کوئی اختیار نہیں دیا۔
لہٰذا کافر کا فیصلہ نہ مسلمانوں پر نافذ ہو سکتا ہے اور نہ کفار پر، مگر چونکہ اس آیت میں صرف کافر
ان پر اختیار کی ممانعت ہے، اس لیے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ کافر کفار کا قاضی ہو سکتا ہے۔
دوسری شرط یہ ہے کہ قاضی کے لیے بالغ اور عاقل ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ نابالغ کے ذمے
اہم کام نہیں لگایا جا سکتا اور عقل کے بغیر مقدمات کی گتھیاں کیسے سلجھ سکتی ہیں۔ چنانچہ امام ماوردی
اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
حتی یکون صحیح التمییز، جید الفطنة، بعیداً عن السهو والغفلة متوصلا
به الی ایضاح ما اشكل وفصل ما اعضل
حق و باطل میں تمیز کرنے والا، نہایت ذہین اور غفلت اور سہو سے دور رہنے والا ہو تاکہ اپنی ذہانت سے
کی وضاحت کر سکے اور مشکلات کا حل ڈھونڈ لے۔
تیسری شرط ذکورۃ یعنی قاضی کا مرد ہونا ہے۔ اکثر علمائے عورت کے لیے عدم جواز قضا کا فتویٰ
۔ مگر امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جن امور میں عورت کی شہادت درست ہے، ان میں قضا بھی
ہے۔ کاسانی اس رائے کی شرح کرتے ہوئے بدائع الصنائع میں لکھتے ہیں:
واما الذکورة فلیست من جواز التقلید فی الجملة، الا انها لا تقضی
ود والقصاص، لانه لا شهادة لها فی ذلك، واهلية القضاء تدور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مع اہلیۃ الشہادۃ ؎۵

جہاں تک قاضی کے لیے مرد ہونے کا تعلق ہے تو یہ کلی طور پر قضا کے جواز کی شرط نہیں ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ عورت حدود اور قصاص کے معاملات میں قاضی نہیں بن سکتی کیوں کہ ان معاملات میں اس کی شہادت قبول نہیں۔ اور اہلیتِ قضا کا شہادت کی اہلیت پر انحصار ہے۔

علامہ ابن جریر طبری نے امام ابوحنیفہ کی اس نصف اہلیت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھے ہیں اور فرمایا ہے کہ عورت تمام احکام میں قضا کے فرائض سرانجام دے سکتی ہے۔ امام الماوردی نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیۃ میں علامہ ابن جریر طبری کی اس وسیع النظری کو تنقید کا ہدف بنایا ہے اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"لا اعتبار بقول یردہ الاجماع مع قول اللہ تعالیٰ "الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضهم علی بعض""

یعنی اس قول کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا جسے اجماع نے رد کر دیا ہو اور خود اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ مرد عورتوں کے قوام مقرر کیے گئے ہیں۔

غالباً وہ قوامون کا معنی حاکم یا اس قسم کی کوئی چیز لیتے ہیں۔ مگر قوام کا تعلق - قام، قوماً، قیام وغیرہ سے ہے۔ قوم کے معنی کھڑا کرنے، قائم کرنے، بیدار کرنے، درست کرنے اور قدر و قیمت کرنے کے ہیں۔ عربی کی شہرۂ آفاق لغت کی کتاب تاج العروس میں قام علیہا کے معنی مانها وقام بشأنها متكفلا بامرها (اس عورت کی روزی مہیا کی اور اس کے امر کی کفالت کرتے ہوئے اس کی حالت کو قائم کیا) لکھتے ہیں۔

چوتھی شرط قوتِ سامعہ اور باصرہ کی سلامتی ہے تاکہ اثباتِ حقوق کی صحت، مدعی و مدعا علیہ میں فرق اور اقرار و انکار کرنے والوں میں امتیاز ممکن ہو اور حق و باطل میں تمیز ہو سکے۔ اس لحاظ سے اندھا قاضی نہیں بن سکتا۔ مگر امام مالک اندھے کو قاضی بننے کی اجازت دیتے ہیں۔ بہرے کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ البتہ سلامتیٔ اعضا قاضی کے لیے ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اپاہج قاضی ہو سکتا ہے۔

؎۵ بدائع الصنائع، ج ۷، ص ۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پانچویں شرط احکام شرعیہ کا علم ہے۔

چھٹی شرط آزادی و حریت ہے یعنی کوئی غلام قاضی نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ غلام تو شہادت دینے کا بھی اہل نہیں ہے وہ تنفیذ احکام اور تفویض عہدۂ قضا کا اہل کیوں کر ہو سکتا ہے۔

ساتویں شرط عدالت ہے، جس کی تعریف ماوردی نے ان الفاظ میں کی ہے۔

ان یکون صادق اللهجة، ظاهر الامانة عفیفاً عن المحارم، متوقیا المآثم، بعیداً عن الریب، مأموناً فی الرضاء والغضب مستعملاً لمروءة مثله فی دینه ودنیاه۔

یعنی عدالت سے مراد یہ ہے کہ صادق القول، امانت دار، حرام چیزوں سے دامن پاک رکھنے والا، گناہوں سے بچنے والا، شبہات سے دور رہنے والا، خوشنودی اور غصہ میں قابل اطمینان اور اپنے ہم مرتبہ لوگوں کی طرح دین و دنیا کے معاملات میں مروت سے کام لینے والا ہو۔

گویا یہ تمام خوبیاں ایک قاضی میں پائی جانی چاہئیں اور ان سب کے لیے ایک لفظ عدالت ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ نے قاضی کے منصب کے لیے عدالت کی شرط نہیں لگائی۔ انھوں نے عدالت کو شرط کمال سے تعبیر کیا ہے۔ انھوں نے فاسق کو بھی قضا کی اجازت دی ہے۔ لیکن امام شافعی نے فاسق کے تقرر برائے قضا کی اجازت نہیں دی، کیوں کہ فاسق کی شہادت قبول نہیں[5]

فقہائے اسلام نے قاضی کے صحیح تقرر کے طریق کی بہت کچھ تحقیق کی ہے۔ ماوردی کہتے ہیں کہ قاضی کے عہدے کا تقرر دو طرح کے لفظوں سے ہوتا ہے، صریح اور کنایہ۔ صریح الفاظ چار ہیں۔ (۱) میں نے تم کو مقرر کیا (۲) والی بنایا (۳) خلیفہ بنایا (۴) نائب بنایا۔ کنایہ کے الفاظ ہمارے علما کے نزدیک سات ہیں (۱) میں نے تم پر اعتماد کیا (۲) بھروسہ کیا (۳) تمھاری طرف لوٹا دیا (۴) تمھاری طرف کر دیا (۵) تمھیں تفویض کیا (۶) تمھاری وکالت میں دیا (۷) تمھاری طرف منسوب کیا۔ تکمیل تقرر کے لیے اس کے علاوہ چار شرائط بھی لازمی ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ تقرر کرنے والا یہ جانتا ہو کہ جس کو وہ قاضی مقرر کر رہا ہے اس میں اس عہدے کی تمام شرائط موجود ہیں ورنہ تقرر صحیح نہ ہوگا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تقرر کرنے والے کو

---

[5] کاسانی۔ بدائع الصنائع جلد ۷، ص ۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علم ہو کہ قاضی نے اپنے فرض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے یا نہیں۔ اس شرط کا تعلق انعقاد تقرر کے ساتھ نہیں، جیسا کہ پہلی شرط کا ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ جس عہدے پر تعین کیا جائے، اس عہدے کا نام لے کر متعین کیا جائے۔ چوتھی شرط شہر کا تعین بھی ضروری ہے جہاں پر کہ اسے متعین کرنا ہے۔ امام ابو الحسن الماوردی نے احکام السلطانیہ میں قاضی کے فرائض پر بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل دس فرائض بیان کیے ہیں:

(۱) تنازعات کا فیصلہ کرنا (۲) صاحبِ حق کو اس کا حق دلانا (۳) جنون اور بچپن کی وجہ سے جن مستحقین کے تصرفات ممنوع ہوں، ان کے نگران مقرر کرنا (۴) اوقاف کی نگرانی (۵) وصیتوں کا نفاذ (۶) اگر بیوہ عورتوں کے ولی نہ ہوں تو رشتہ آنے کی صورت میں ان کا نکاح کرانا۔ امام ابوحنیفہ یہ کام قاضی کے ذمے نہیں ڈالتے بلکہ ان کا خیال ہے کہ بیوہ خود اپنا نکاح کر سکتی ہے۔ (۷) حدود (سزاؤں) کا جاری کرنا (۸) اپنے حلقۂ عمل میں مصالح کا خیال رکھنا اور سڑکوں پر ناجائز تجاوزات کو روکنا اور ناجائز عمارت یا مکان وغیرہ نہ بننے دینا۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ قاضی یہ کام بغیر کسی مدعی کے استغاثہ کے نہیں کر سکتا۔ (۹) گواہوں اور اپنے اعتماد کے لوگوں کی چھان بین کرنا۔ نیک چلن اور اچھے منتظمین کو عہدوں پر برقرار رکھنا اور بدچلن اور نااہل کارندوں کی جگہ بہتر لوگوں کو دینا (۱۰) مقدمات کے فیصلوں میں ضعیف اور طاقتور میں امتیاز نہ کرنا۔

اگر قاضی قضا میں غلطی کرے اور غلط فیصلہ کرے اور بعد کو اس کی حقیقت کھل جائے تو قاضی سے باز پرس نہ ہوگی، کیوں کہ اس نے حقیقت کی چھان بین میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا بلکہ وہ تو حسبِ امکان مصلحت کا ہی طالب تھا۔ اگر مال کے متعلق فیصلہ دیا تھا تو اگر وہ مال بدستور موجود ہو تو حقیقی مالک کو لوٹا دے، اور اگر جس کے حق میں فیصلہ ہوا تھا اس نے مال کو تلف کر دیا ہے تو اس سے ضمانت لے۔ اگر فیصلہ مالی نہیں ہے جیسے کہ حکم طلاق تو پھر اس حکم کو منسوخ کر دے اور اگر فیصلے کا تعلق حقوق اللہ میں سے کسی ایک حق کے متعلق ہے تو پھر بیت المال پر تعویض (بدلے کی) ذمے داری ہوگی۔ کیوں کہ قاضی کا حکم مسلمانوں کی بھلائی کے لیے تھا۔ اس لیے اس تعویض کا بوجھ مسلمانوں پر بذریعہ بیت المال کے پڑے گا۔[۵۶]

---

[۵۶] کاسانی: بدائع الصنائع جلد ۷، ص ۱۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قضا ایک امر واجب ہے اور کوئی معاشرہ اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، کیوں کہ عدلیہ کا فرض ہے کہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ حاکم کا فرض ہے کہ عادل کو منصبِ قضا پر فائز کرے اور اس عہدے کے محض طالب گار کو یہ منصب تفویض نہ کرے۔ امام ماوردی نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ میں طلبِ قضا کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں غیر مجتہد کسی صورت میں قاضی نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ طالب اہل اجتہاد ہو۔ اس کی تین صورتیں ہیں، اول یہ کہ وہ ایک نا اہل یا ظالم کو منصبِ قضا سے ہٹانے کے لیے اس کی جگہ اپنی خدمات پیش کر رہا ہے۔ اس صورت میں وہ مستحقِ اجر ہے۔ دوسری صورت عداوتِ ذاتی ہو سکتی ہے جس کی بنا پر وہ ایک قابل آدمی کو ہٹا کر خود قاضی بننا چاہتا ہے تو یہ طلب ممنوع ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ خالی جگہ پڑی ہے اور بیت المال سے تنخواہ ملنے کی امید میں طلب کرتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اگر عزت و منزلت کے لیے طلب ہے تو اس کے جواز میں اتفاق ہے مگر کراہت میں اختلاف ہے۔ بعض علما کے نزدیک مکروہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مکروہ نہیں ہے کیوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا اجعلنی علی خزائن الارض۔ اسی سلسلے میں یہ مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ظالم کی طرف سے پیش کی گئی ولایتِ قضا قبول کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر حق پر عمل ہو سکے تو جائز ہے کیوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی خیال سے درخواست کی تھی۔ مگر جو اسے ناجائز سمجھتے ہیں اور ظالم کی ولایتِ قضا سے منع کرتے ہیں وہ یہ دو جواب دیتے ہیں۔ اول یہ کہ حضرت یوسفؑ کا فرعون نیک تھا اور حضرت موسیٰؑ کا فرعون طاغی تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت یوسف مال کے نگران تھے، حاکم یا عامل نہ تھے۔ منصبِ قضا کے حصول کے لیے مال و دولت خرچ کرنا رشوت دینے کے برابر ہے۔

منصبِ قضا کے ترک (رفض) کے حکم کا انحصار اہل کفاءۃ (یعنی اس منصب کی اہلیت رکھنے والے) کی رسد (supply) اور قوم کو ان کی ضرورت یا طلب (Demand) پر ہے۔ اگر صرف ایک ہی شخص کو اس منصب پر متعین کیا جاتے اور اس کے سوا اور کوئی اس عہدے کا اہل نہ مل سکے تو اس کا قبول کرنا اس شخص پر فرض ہوگا کیوں کہ امت کو اس کی ضرورت ہے[۵] اور اگر متعدد اشخاص اس

---

۵ کاسانی: بدائع الصنائع، جلد ۷، ص ۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے اہل ہوں تو کسی کو اس کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عصور اسلامیہ میں بہت سے علمائے کرام نے منصب قضا کو ترک کیا ہے اور بعض کو تو اس ترک کی وجہ سے مارا بھی گیا ہے، جیسا کہ امام ابو حنیفہ کو اس منصب کو ٹھکرانے پر کوڑے لگائے گئے تھے[۵۵] مگر علمائے متاخرین کا منصب قضا کو قبول کرنے سے انکار کرنا شاید اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے فیصلے میں اپنے آپ کو آزاد محسوس نہیں کرتے تھے اور ان کو خوف تھا کہ حکومت وقت ان کے فرض منصبی میں دخل انداز ہوگی اور انھیں ایسا فیصلہ دینا ہوگا جو ان کے ضمیر کے خلاف ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے علمائے دین کے اس موقف نے انھیں تاریخ اسلامی میں بلند مقام عطا کیا ہے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت بہت بڑھی ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عدلیہ اسلام میں ہمیشہ حقوق انسانی کی علمبردار رہی ہے اور اس نے ایسے ذہین، عادل اور نڈر قاضی پیدا کیے ہیں جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

---

۵۵ عبارت یوں ہے: روی ان ابا حنیفة رضی الله عنه عرض علیه القضا فضربه حتی ضرب علی ذلك ولم یقبل وکذا لم یقبله کثیر من صالحی الامة۔

مجموعۂ تفاسیر ابو مسلم اصفہانی

سید نصیر شاہ و محمد رفیع اللہ

مشہور معتزلی مفسر ابو مسلم کے ان تفسیری اقوال کا مجموعہ جو امام رازی نے اپنی تفسیر میں مختلف مقامات پر نقل کیے تھے۔ جہاں ابو مسلم نے دوسرے مفسرین سے اختلاف کیا ہے وہاں مختصراً دوسرے مفسرین کے اقوال بھی پیش کر دیے گئے ہیں۔

صفحات ۱۹۲ قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com